اسلامی قانون ۔ ایک عمومی تعارف

محمود احمد غازی

اواخر مارچ ۱۹۹۶ میں اسلامیہ یونی ورسٹی ، بہاول پور کی دعوت پر ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اسلام کے قانون بین الممالک کے چند پہلوؤں پر بارہ خطبات دیے ۔ ان خطبات کی تدوین کا کام جاری ہے ۔ مکمل ہونے پر ان شاء اللہ کتابی صورت میں اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور سے شائع ہوں گے ۔ اس سلسلہ کا پہلا خطبہ اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور کی اجازت سے شائع کیا جارہا ہے ۔ (مدیر)

اس دور میں اسلامی قانون عام طور پر اور اسلام کا قانون بین الممالک خاص طور پر مسلمانوں کے لیے بڑی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوگئے ہیں ۔ آج مسلمانوں کی بقا اور دنیائے اسلام کی آزادی کے تحفظ کا دارومدار بڑی حد تک ان کی فہم شریعت پر ہے ۔ آج جو طرز عمل وہ فقہ اسلامی کے بارے میں اختیار کریں گے وہ آیندہ آنے والے بہت سے فکری ، ثقافتی اور تہذیبی مسائل میں ان کے رویے کا تعین کرے گا ۔ آج دنیائے اسلام ایک غیر معمولی فکری کشمکش سے گزر رہی ہے جس کا سب سے بڑا محور اسلامی قانون کے بنیادی تصورات اور اساسی اصول ہیں ۔ اگر دنیائے اسلام کامیابی کے ساتھ اس کشمکش سے گزر گئی تو خوش آیند مستقبل ' باوقار آزادی اور اقوام عالم میں قائدانہ اور معلّمانہ کردار اس کے منتظر ہیں ۔ بصورت دیگر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کشمکش اور کتنی طویل ہوگی اور کہاں جاکر ٹھہرے گی ۔

شاید یہی وجہ ہے کہ آج سے تقریباً پچھتر سال پہلے علامہ اقبال نے اسلامی قوانین پر غور خوض کی ضرورت کا احساس کیا ۔ انھوں نے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام ایک خط (۱۹۲۵) میں لکھا تھا کہ مسلمانوں کے لیے یہ بڑا نازک دور ہے اور مذہب اسلام زمانے کی کسوٹی پر کسا جارہا ہے ۔ مسلمان یا تو اپنی آزادی و بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں یا اسلامی قوانین پر غور کر رہے ہیں ۔ پھر علامہ اقبال نے لکھا کہ میرے خیال میں اس زمانے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ دور جدید کے اصول قانون پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام اسلام کی ابدیت کو ثابت کیا جائے اور جو شخص اس کام کو کرے گا وہ میرے نزدیک اس دور کا مجدد ہوگا ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کی نظر میں پاکستان بننے سے تقریبا

۳۰ سال پہلے، اسلامی قوانین پر غور و فکر اور تحقیق کا کام کتنی اہمیت رکھتا تھا اور وہ برصغیر کے مسلمانو
کی آزادی کے بعد پیش آنے والے مسائل و معاملات پر کتنی گہرائی سے غور کر رہے تھے۔ علامہ اقبا
کی مختلف تحریروں اور بیانات میں ان خطوط کی طرف اشارے بھی ملتے ہیں جن کی بنیاد پر وہ اسلا
قوانین پر غور کرنا چاہتے تھے۔ آج ہماری من حیث القوم یہ ذمہ داری ہے کہ ہم علامہ اقبال
افکار و تجاویز کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسا نقشہ کار وضع کریں جس سے کام لے کر اسلامی قوانین
نفاذ کیا جاسکے اور دور جدید کے انسان ساختہ قوانین پر ان کی برتری ثابت کی جاسکے۔

دور جدید کے وہ مسلم دانش ور اور محققین جو اسلامی قانون اور فقہ سے واقفیت رکھتے ہیں،
جن کو اللہ نے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ دور جدید کے اصول قانون اور تصورات قانون پر نگاہ ڈ
سکیں ان کی آج یہ ملی اور اجتماعی ذمہ داری ہے کہ وہ احکام اسلامیہ کی ابدیت کو ثابت کریں اور د
جدید کے تصورات کی روشنی میں دنیا کو یہ بتائیں کہ اسلام کے قوانین ہی انسان کے درد کا مداوا ہیں
ایک صحیح الخیال مسلمان جس کو اس بات کا مکمل یقین ہے کہ اسلام ہی اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام
جس کو اس بات پر شرح صدر حاصل ہے کہ اسلام کا قانون ہی انسان کے انفرادی اور اجتماعی مسائل
حل ہے اور جو ہر دور میں اسلامی شریعت کی معنویت اور صلاحیت پر کامل ایمان رکھتا ہے۔ اس
لیے تو معاملہ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے جو توجہ دلائی ہے وہ ان لوگوں کو مطمئن کرنے ا
قائل کرنے کے لیے ہے جن کا اسلام پر ایمان یا تو ہے نہیں یا کمزور ہو چکا ہے، جو اسلام پر یا تو کار
نہیں ہیں یا اسلام سے ان کی وابستگی بہت کمزور ہو چکی ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے اسلام کے تص
حیات، پیغام، تعلیمات اور قوانین کو اس انداز میں پیش کرنا کہ وہ دور جدید میں احکام اسلامیہ کی ابدیت
پر پوری طرح مطمئن ہو جائیں، وقت کی سب سے بڑی علمی اور فکری ضرورت ہے۔ یہ درحقیق
ایک مجددانہ کام ہے جو پوری دنیا کے مسلمانوں کا بالعموم اور پاکستانیوں کا بالخصوص ایک اجتماعی فر
ہے۔ کیونکہ پاکستان ہی کے مصور اور پاکستان ہی کے فکری بانی اور مؤسس نے اس کی اہمیت کو س
سے پہلے محسوس کیا تھا اور اس کی طرف توجہ دلائی تھی۔

اسلامی قوانین کی ایک دوسری اہمیت بھی ہم پاکستانیوں کی ملی اور اجتماعی زندگی کے لیے خاص
پر اور دنیائے اسلام کی ملی اور اجتماعی زندگی کے لیے عام طور پر محسوس کی جا رہی ہے اور وہ یہ ہے
آج مسلمان اپنے بقا اور تشخص کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ دنیا میں ہر جگہ عالم گیر قوتیں ان کے تشخص
مٹانے کے درپے ہیں۔ اور مسلمانوں کو ایک عالمی نظام میں اس طرح سمو لینے کی کوششیں ہو رہی
کہ مسلمانوں کو یہ محسوس ہی نہ ہوسکے کہ ان کا تشخص کہاں کہاں مجروح ہوا ہے اور کیسے کیسے ان
جسد ملی کو تار تار اور بے زبان و بے لباس کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ آج مسلمانوں کی تاریخ

حملے کیے جا رہے ہیں' مسلمانوں کے اقتدار کو مغربی طور طریقوں اور ان کی ثقافت کو تنقیدی حملوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ وہ علاقے' وہ تہذیبیں اور وہ ممالک جو آزادی رائے رکھتے ہیں' اور آزادی گفتار کا مرکز سمجھے جاتے ہیں' جہاں سے جدید مغربی انقلاب کا آغاز ہوا' جس کا بنیادی نعرہ ہی آزادی' مساوات اور برابری تھا۔

آج وہاں مسلمان بچیوں کو سر پر چادر ڈالنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے محسوس کر لیا ہے کہ یہ چھوٹی سی چیز' جس کو چاہے اسلامی دنیا میں زیادہ اہمیت کا حامل نہ سمجھا جا رہا ہو' ایک بہت بڑے انقلاب اور تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ ان کے خیال میں پیرس کی ایک نواحی بستی میں اگر ایک مسلمان بچی اس پر اصرار کرتی ہے کہ وہ سر ڈھک کر سکول جائے گی تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کو اپنے تشخص اور انفرادیت کا احساس ہو چلا ہے جو آگے چل کر دوسرے پہلوؤں میں بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔

آج مغرب کو جو چیز سب سے زیادہ خطرہ کا باعث محسوس ہو رہی ہے وہ اسلام کا قانون اور مسلمانوں کی شریعت اور نظام حکومت ہے۔ پچھلے پچاس برسوں کے دوران مغرب کے مفکرین نے اسلامی قوانین اور شریعت پر جو کچھ لکھا ہے اس کی بنیادی اسپرٹ اور روح یہ رہی ہے کہ دنیا کو یہ باور کرا دیا جائے کہ اگر اسلامی قوانین ایک بار پھر اسلامی دنیا میں کارفرما ہو گئے تو اس سے مغرب کی تہذیبی اور فکری بالادستی کو ٹھیس پہنچے گی لہٰذا اپنی بالادستی کے تحفظ کی خاطر بالادست مغربی قوتوں کی کوشش غیر شعوری اور شعوری دونوں طرح سے یہ ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی قوانین سے دور رکھا جائے اور ان کے بارے میں ایسی غلط فہمیاں پیدا کر دی جائیں کہ مسلمان اس سے دور ہوتے چلے جائیں۔

ان حالات میں اسلامی قوانین پر بالعموم اور اسلام کے بین الاقوامی قوانین پر بالخصوص مسلمانوں کو سنجیدگی اور ذمہ داری سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بین الاقوامی قوانین پر غور کرنے کی ضرورت خاص طور پر اس لیے ہے کہ آج دنیا کے لیے نئے نظام تشکیل دیے جا رہے ہیں' بین الاقوامیت کا دور دورہ ہے' ہر چیز میں ایک قسم کی عالم گیریت پیدا ہو رہی ہے۔ مغربی دنیا بھی اس کرۂ ارض پر اپنی بالادستی کو قائم رکھنے کے لیے ایک نیا ورلڈ آرڈر تشکیل دے رہی ہے۔ جس کے لیے ایک نیا عالم گیر نظام' نئی عالمی تہذیب اور سیاست و معیشت کے نئے نقشہ ہائے کار ترتیب دیے جا رہے ہیں۔

مغربی دنیا محسوس کرتی ہے کہ اس کو نیا عالمی نظام بنانے کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر کسی قوم یا تہذیب کے پاس پہلے سے بنا بنایا نظام موجود ہو' بین الاقوامی تعلقات' بین الاقوامی قانون' لین دین اور بین الاقوامی میل جول کا پورا نظام پہلے سے موجود ہو' اس کو ظاہر ہے کہ از سرِ نو کسی نظام کی تشکیل کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ایسی کسی قوم یا تہذیب کی یہ ذمہ داری ضروری ہے کہ وہ زمانے کے

تغیرات اور تقاضوں کو پیش نظر رکھے اور ہر دور کی زبان اور محاورہ بیان میں اپنے تصورات کو پیش کرتی رہے۔ آج ہماری یہی ذمہ داری ہے کہ ہم اسلام کے عالمی نظام کے بنیادی تصورات کو دور جدید کے سیاق میں سمجھنے کی کوشش کریں ' بلکہ اس دور کی زبان میں ان تصورات کو پیش کریں اور اس دور کے تصورات پر تحقیقی نگاہ ڈال کر احکام اسلامیہ کی ابدیت کو ثابت کریں۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں اسلامی قانون ایک کلی نظام ہے۔ یہ ایک ایسا مکمل نظام قانون ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں اصول و ہدایات دیتا ہے۔ یہ ملکی ' ریاستی ' قومی اور بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں اپنے طے شدہ اور واضح تصورات رکھتا ہے۔ لیکن جب تک یہ تمام چیزیں ضروری تفصیلات اور عملی مثالوں کے ساتھ ہمارے سامنے نہ آجائیں اس وقت تک ہمارے لیے یہ فرض کر لینا درست نہیں ہو گا کہ دنیا نے اسلام کو بطور ایک مربوط اور قابل عمل نظام زندگی کے تسلیم کر لیا ہے۔ جب تک ہم دور جدید کے مغرب زدہ اور لادینیت گزیدہ دانشور کو عقلی دلائل سے اس بات پر مطمئن نہیں کر دیں گے کہ اسلام کا قانون سچ مچ انسانوں کے مسائل و مشکلات کو حل کر دیتا ہے اس وقت تک ہم خود اسلامی ممالک میں بھی اسلامی قوانین کے نفاذ کی راہ میں کوئی پیش رفت نہ کر سکیں گے۔ ہمیں عام مسلمانوں ' روایتی ایمان اور رواجی عقائد و اعمال پر بھروسہ کر کے نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ یہ فرض کر لینا کہ آج کا ایک عام مسلمان اسلام کی ابدیت اور اسلامی قانون کی صلاحیت و عملیت کا اسی طرح قائل ہے جس طرح ایک صاحب ایمان کو ہونا چاہیے ' ایک خطرناک اور تباہ کن مفروضہ ہے۔

یہ دور تاریخ اسلام کا نازک ترین دور ہے۔ آج مختلف ذرائع سے دنیائے اسلام پر حملے ہو رہے ہیں۔ پبلسٹی اور پروپیگنڈے کا ایک طوفان ہے جو دنیائے اسلام کے خلاف کھڑا کر دیا گیا ہے۔ یہ دور معلومات کی وسعت اور نت نئے انکشافات کے انفجار (explosion) کا دور ہے۔ انفجار معلومات کی جتنی شکلیں انسانوں کے تصور میں آسکتی ہیں وہ سب اس دور میں استعمال کی جا رہی ہیں۔ آج سے پچاس سال قبل لوگوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ معلومات و اطلاعات اس تیز رفتاری کے ساتھ ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف منتقل کی جا سکتی ہیں جتنی وسعت کے ساتھ آج منتقل ہو رہی ہیں۔ آج ایک مغربی ملک میں ایک مفکر ایک نظریہ پیش کرتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پورے کرۂ ارض کے علمی حلقوں میں بحث و تمحیص کا موضوع بن جاتا ہے۔ آج ایک بڑی طاقت کا سربراہ نئے عالمی نظام کا ذکر کرتا ہے اور دنوں یا ہفتوں میں نہیں گھنٹوں کے اندر اندر وہ دنیا بھر کی سیاسیات کا سب سے اہم عنوان قرار پا جاتا ہے۔

اس صورت حال سے دنیائے اسلام بھی متاثر ہو رہی ہے۔ آج پاکستان کی ایک ماتحت عدالت

میں ایک غیر مسلم کے خلاف ملکی قانون کے تحت ایک مقدمہ دائر ہوتا ہے اور چند دنوں کے اندر اندر وہ دنیا کے اخبارات اور ذرائع ابلاغ کی خبروں اور فیچروں کی سب سے اہم خبر بن جاتا ہے یا بنا دیا جاتا ہے۔ ایک عدالت سے دو غیر ملکیوں کو قانون کے مطابق سزا ہوتی ہے اور روئے زمین کے ہر گوشہ سے اتنا شدید ردعمل سامنے آتا ہے کہ کمزور ایمان مسلمان اور کمزور تخت و تاج والے حکمران اندر سے حیران و پریشان اور باہر سے لرزاں و ترساں نظر آتے ہیں۔ ایک مسلم ملک میں ایک عالم دین ایک بات کہتا ہے اور دنیا اس طرح ہل جاتی ہے جیسے کوئی خستہ حال عمارت زلزلہ کا شکار ہوگئی ہو۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ آج کا دور محدودیت کا دور نہیں ہے۔ آج کا دور کسی انغلاق کا دور نہیں ہے، کہ کوئی قوم اپنے کو کسی خول میں بند کر کے یہ سمجھنے لگے کہ وہ اپنے کو محفوظ کر لینے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ آج کا دور تفتح کا دور ہے۔ دنیا کی ہر قوم اپنے دروازے اور کھڑکیاں دوسروں کے لیے کھول دینے پر مجبور ہے۔ سوویت یونین جیسی دہشت انگیز طاقت تک کے آہنی پردے ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں۔ ان حالات میں مسلمانوں کا یہ سمجھ لینا کہ ہم دنیا سے آنکھیں بند کر کے دنیا کی آنکھیں بھی بند کر دیں گے درست نہیں ہے۔ آج مسلمان جو کچھ کریں گے اس کے اثرات پوری دنیا پر ہوں گے۔ آج مسلمان جو کہیں گے وہ ساری دنیا میں سنا جائے گا۔ اور اس پر موافقانہ اور مخالفانہ دونوں انداز سے رائے زنی ہوگی۔ جو پالیسیاں آج دنیائے اسلام میں اختیار کی جائیں گی ان کا مثبت اور منفی دونوں طرح کا ردعمل فوراً سامنے آئے گا۔ مسلمان اہل دانش آج جس طرح سوچیں گے اس کے اثرات فوراً ہی کرۂ ارض پر محسوس ہوں گے۔

ان حالات میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہمیں ہر ہر میدان میں بڑی احتیاط اور انتہائی غور و فکر اور گہرے تدبر کی ضرورت ہے۔ ہمیں کسی بھی سمت کوئی بھی پیش قدمی کرتے وقت ہزار بار سوچ لینا چاہیے۔ یہاں میں ایک بار پھر علامہ اقبال کے الفاظ دہراتے ہوئے کہوں گا کہ اس وقت مذہب اسلام بین الاقوامی سطح پر حالات و زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ آج کا سکہ رائج الوقت بازار اسلام میں قابل قبول نہیں اور سکہ اسلام بازار وقت میں کار آمد معلوم نہیں ہوتا۔ آج جن نظریات کا چلن ہے وہ اسلامی عقائد و نظریات سے متصادم ہیں۔ دوسری طرف ہم جن احکام و تعلیمات پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہیں، ان کو دور جدید کا ذہن قبول نہیں کرتا۔ اس کے ذہن کی ساخت ایسی بن چکی ہے یا بنا دی گئی ہے کہ اس میں اسلامی تعلیم ایک اجنبی اور اوپری چیز ہو کر رہ گئی ہے۔ آج زندگی کا کون سا گوشہ ایسا رہ گیا ہے جس کے بارے میں اسلام کا موقف سمجھنے اور مان لینے میں خود مسلمانوں کو الجھنیں نہ پیش آرہی ہوں۔

خود پاکستان کی مثال لے لیں۔ یہاں ۱۹۷۹ میں حدود کے قوانین نافذ ہوئے تو ایسے بہت سے

لوگوں نے جن میں کئی خواتین بھی شامل تھیں، ان پر ایسے ایسے اعتراضات کیے جن کی توقع کسی مسلمان سے ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ انگریزی قانون سے مانوس اور اسلامی تصورات سے عقلاً نامانوس اور علمی طور پر ناواقف ہونے کی وجہ سے بعض ایسی ایسی باتیں کہی گئیں جن کو سن کر سوائے اِنَّالِلّٰہ پڑھ لینے کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ حدود کے نفاذ سے قبل پاکستان کے فوج داری قانون میں بدکاری اگر باہمی رضامندی سے ہو تو جرم نہ تھی۔ اگر بدکاری کے مرتکبین شادی شدہ بھی ہوں اور متعلقہ فریقین کے زوجین کو اعتراض نہ ہو تو انگریزی شریعت کی رو سے یہ ایک جائز فعل تھا۔ جن صورتوں میں تعزیرات پاکستان نے بدکاری کو جرم قرار بھی دیا تھا وہاں صرف مرد کو مجرم گردانا گیا تھا، عورت مجرم نہ تھی۔ جب قوانین حدود کی رو سے عورتوں اور مردوں کو بدکاری کی ہر صورت میں مجرم قرار دیا گیا تو اس کو خواتین کے ساتھ زیادتی قرار دیا گیا۔ اسی طرح کے اعتراضات حدود کے دوسرے قوانین پر بھی کیے گئے، تزکیۃ الشہود کے اصول کو ناقابل عمل بتایا گیا، عادل گواہ کی شرائط کی اخباری مضامین میں تضحیک کی گئی، سزائے تازیانہ کو انسانیت کی توہین قرار دیا گیا، قطع ید کی سزا پر عمل درآمد کے سلسلہ میں مضحکہ خیز اور افسوسناک شبہات اٹھائے گئے۔

۱۹۸۴ میں قانون شہادت آرڈر کے نفاذ اور اس سے پہلے مجوزہ قانون شہادت کی دفعات پر اعتراضات کے وہ وہ طوفان اٹھائے گئے جو قبل ازاں شاید غیر مسلموں نے بھی نہ اٹھائے ہوں۔ یہی حال ۱۹۹۰ کے قصاص و دیت آرڈیننس اور قانون توہین رسالتؐ کے ساتھ ہوا۔ قبل ازیں ایسے ہی اعتراضات امتناع قادیانیت آرڈیننس کے بارے میں اٹھائے گئے تھے۔ یہاں ان سب اعتراضات کو دہرانا تو ممکن نہیں ہے جو ایک حلقہ کی طرف سے ان قوانین پر کیے گئے، لیکن ان سب میں جو بات قدر مشترک تھی، وہ یہ تھی کہ اعتراضات کرنے والوں میں ہمارے ملک کے سیکولر طبقہ کے ساتھ یہاں کے بعض اقلیتی مذہبی لیڈر اور مغربی ذرائع ابلاغ مکمل طور پر ہم آواز تھے۔ ان قوانین کو جس زاویہ نگاہ سے ایک ہندو لیڈر دیکھ رہا تھا اسی زاویہ نگاہ سے ایک مغربی تعلیم یافتہ پاکستانی مسلمان بھی دیکھ رہا تھا۔ ان قوانین کے بارے میں جو رائے ایک عیسائی لیڈر کی تھی وہی ہماری بعض مغرب زدہ خواتین کی بھی تھی۔ ان قوانین پر جو اعتراضات پاکستان کے روایتی دشمنوں کی طرف سے اٹھائے جا رہے تھے وہی ہمارے بعض اخبارات میں بھی دہرائے جا رہے تھے۔

اس صورت حال کا صرف ایک سبب ہے اور وہ یہ ہے کہ آج ہمارے قانون دان طبقہ میں بالخصوص اور مغربی تعلیم یافتہ طبقہ میں بالعموم اسلامی تصورات اور قانون کے بارے میں اسلامی تعلیمات سے گہری واقفیت رکھنے والے حضرات خال خال ہی پائے جاتے ہیں۔ وہ جن تصورات سے واقف اور جن نظریات سے مانوس ہیں وہ مغربی لادینی مسیحی تصورات ہیں۔ ان کے ہاں قانون، اور

پوری سیاسی زندگی کا اساسی اصول دین و سیاست کی علاحدگی ہے۔ یہاں یہ بات ایمان و ایقان کا جزو ہے کہ جب دین و دولت میں جدائی ہو تو پھر چار سو، ہوس ہی کی حکمرانی قائم ہو جاتی ہے۔ وہاں تصور یہ ہے کہ ریاست کو کسی اخلاقی نظریہ سے وابستگی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے اور ایک لااخلاقی (amoral) نقطہ نظر اپنانا چاہیے۔ یہاں ریاست کا مقصد وجود ہی اسلامی اخلاقی کردار کا فروغ اور تحفظ ہے، وہاں قانون کی بنیاد عامتہ الناس، اور درحقیقت بااثر طبقوں کے مفاد اور پسند و ناپسند کو بنایا جاتا ہے۔ یہاں قانون کے جائز ہونے کی واحد بنیاد وحی الٰہی سے ہم آہنگی ہے، وہاں معیار حق و باطل انسانوں کی مادہ پرستانہ عقل ہے۔ جب کہ حق و باطل کا تعین کتاب الٰہی سے ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ تصورات کے ان بنیادی اختلافات کی صورت میں یہ بات فطری ہے کہ مغربی تصورات کے علم بردار اور مغربی نظریات سے مسلح حضرات اسلامی قوانین اور احکام کو قبول کرنے میں تامل کریں اور ان پر اعتراضات کرنے میں اہل مغرب کے ہم آواز ہوں۔ اس صورت حال کو نہ اظہار نفرت سے تبدیل کیا جا سکتا ہے اور نہ درشت کلامی سے۔ ان حالات میں نہ کوئی فتویٰ اثر انداز ہو سکتا ہے اور نہ اجتماعی نکیر۔ اس صورت حال کو تبدیل کرنے کے لیے ایک بھرپور فکری تحریک کی ضرورت ہے جس کا ایک اہم حصہ اسلامی قوانین اور اصول شریعت کی فکری تشریح اور فلسفیانہ توضیح ہے۔ جب تک سنجیدہ عقلی دلائل سے ان حضرات کو اسلامی عقائد و تعلیمات سے مطمئن نہیں کیا جائے گا محض عامتہ الناس کی جذباتی مذہبیت کی بنیاد پر کوئی دیرپا عمارت تعمیر نہیں کی جا سکے گی۔

آج کا دور اصول و نظریات کی کشمکش اور ثقافتوں اور تہذیبوں کے تصادم کا دور ہے۔ آج نام ور مغربی مفکرین اور مورخین زور و شور سے اس فکری کشمکش اور تہذیبی تصادم کی باتیں کر رہے ہیں۔ آج نہ صرف ملکی قوانین اور پالیسیاں بلکہ تعلیم و ثقافت سے لے کر آرٹ اور روز مرہ زندگی کے مظاہر تک سب اس بنیادی تصور زندگی اور نظریہ حیات یعنی نظریہ کائنات weltan schauung سے اس طرح وابستہ ہیں جس طرح کسی درخت کی شاخیں اور پھول اس کی جڑ سے وابستہ ہوتے ہیں۔

آج کے اس نظریہ حیات کا ایک امتیازی وصف مذہب کے معاملہ میں (بظاہر) ایک مکمل غیر جانب داری ہے۔ لیکن درحقیقت آج کے سارے اجتماعی تصورات یا تو مذہب دشمن ہیں یا لامذہبی طرز عمل پر مبنی ہیں یا کم از کم مذہب کے بارے میں غیر جانب داری کے مدعی ہیں۔ اس کا ایک اہم اور لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج کا انسان مذہبی عقائد کے بارے میں کسی اجتماعیت کو قبول کرنے میں سخت پس و پیش سے کام لیتا ہے اور مذہب کے معاملہ میں انفرادیت پسندانہ رویہ کو ہی ایک قابل قبول اور قابل برداشت رویہ سمجھتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کے لیے یہ رویہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اسلام نہ بدھ بھکشوؤں کی طرح دنیا سے فرار کی تعلیم دیتا ہے اور نہ مسیحیت کی طرح اجتماعی زندگی کو دینی راہ نمائی اور وحی الٰہی کے دائرہ سے خارج کرتا ہے۔ اسلام جہاں مذہبی عقائد و عبادات کا ایک مجموعہ ہے وہاں وہ ایک مکمل اجتماعی پروگرام بھی ہے۔ وہ ایک معاشرتی نظام بھی ہے۔ وہ ایک واضح اور مربوط قانون بھی ہے۔ اس کا اپنا ایک نظام زندگی اور تصور زندگی بھی ہے۔ اس میں ایسی انفرادیت پسندی اور اجتماعیت فراری کا سرے سے کوئی تصور یا امکان موجود نہیں ہے۔ اجتماعی زندگی سے اسلام کو دیس نکالا دینے کا کوئی مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ قرآن پاک کے بے شمار احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لاتعداد ارشادات ایسے ہیں جن پر انفرادی طور پر عمل کیا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ صرف ایک اجتماعی نظام میں ہی روبہ عمل آ سکتے ہیں۔ آخر نماز باجماعت، زکوٰۃ، حج اور جہاد سے لے کر معاملات اور کاروبار میں حلال و حرام کی قیود تک کون سے احکام ایسے ہیں جن پر کسی قسم کی اجتماعیت کے بغیر عمل ہو سکتا ہو۔ کیا ایک منٹ کے لیے بھی کوئی مسلمان یہ سوچ سکتا ہے کہ اسلام اسی طرح کا ایک محدود انفرادیت پرست مذہب ہے جس طرح بدھ مت یا مسیحیت 'مذہب' کہلاتے ہیں۔

بلاشبہ اسلام میں فرد کی تربیت اور کردار سازی پر بڑا زور دیا گیا ہے، یقیناً اللہ کے حضور ہر انسان انفرادی طور پر ہی جواب دہ ہو گا، بے شک انسان اپنے عقائد و عبادات اور نیت و عزائم کے بارے میں خود ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کس حد تک اخلاص پر مبنی ہیں، لیکن ان چیزوں کی بنیاد پر اسلام کو کسی طرح بھی سیکولر نظام کا علم بردار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ آج بہت سے مغرب زدہ مسلم مفکرین جب اسلام میں اس طرح کے انفرادی احکام کو دیکھتے ہیں تو وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ اسلام کی یہ انفرادیت دوسرے مذاہب کی طرح کی ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ اسلام میں بہت سے معاملات ایسے ہیں جن کے بارے میں فرد انفرادی طور پر ہی اللہ تعالیٰ کو جواب دہ ہے تو وہ ان معاملات کی تعبیر سیکولرزم کے انداز کی کرنے لگتے ہیں۔ ایسے حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام میں خالص انفرادی معاملات اور تقاضوں اور فرد کی ذاتی ذمہ داریوں کے علاوہ بھی بہت سے احکام اور تقاضے ہیں۔ اسلام میں دیوانی قوانین بھی ہیں، فوج داری احکام بھی ہیں، دستوری اصول بھی ہیں، انتظامی ہدایات بھی ہیں، بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی سیاست کے ضابطے بھی ہیں، ان سب اصول و ہدایات اور احکام و ضوابط پر عمل درآمد کرنے اور کرانے کے لیے اسلامی ریاست اور اسلامی حکومت کا ہونا بھی ضروری ہے۔

اسلامی تعلیمات کے ان تمام پہلوؤں کو مجموعی طور پر پیش نظر رکھا جائے تو خود بخود یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں ہر شعبہ زندگی میں راہ نمائی فراہم کرنے والے احکام کا ایک جامع مجموعہ

موجود ہے۔ ان میں وہ تمام مثبت پہلو موجود ہیں جو جزوی طور پر دنیا کے دوسرے بہت سے نظاموں میں پائے جاتے ہیں۔ سیکولرزم، مغربی جمہوریت، سوشلزم اور ایسے ہی دوسرے نظاموں میں جزوی طور پر بعض مثبت پہلو یقیناً پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے ان نظاموں کو دنیا کے بڑے بڑے علاقوں اور ممالک میں پذیرائی ملی۔ لیکن ان نظاموں میں ان مثبت پہلوؤں کو محض جزوی اور یک رخے انداز سے لیا گیا ہے، جب کہ اسلام میں وہ ایک مجموعی اور مربوط کل کے اجزا ہیں۔ اسلام نے ایک کلی نظام کی تعلیم دی ہے جو بحیثیت مجموعی انسان کی تمام ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اسلام نے انسانی زندگی کے سارے پہلوؤں کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور ان سب کے تقاضوں کی رعایت رکھی ہے۔ اسلام نے مسائل کی جزوی نہیں کلی اور ہمہ گیر اصلاح کی ہے۔ وہ یک رخی نہیں، ہمہ جہت اصلاح کا داعی ہے۔

اس کلی اور ہمہ گیر اصلاح کے لیے ایک کلی اور ہمہ گیر طرز فکر کی ضرورت ہے۔ جب تک انسان کا رویہ ساری کائنات کے بارے میں جامع اور ہمہ جہت نہ ہو گا اس کے لیے کسی جامع اور ہمہ جہت اصلاح کی سمت میں پیش قدمی کرنا ممکن نہ ہو گا۔ یہ کلی اور ہمہ گیر طرز فکر، یہ جامع رویہ، یہ ہمہ جہت اصلاحی طرز عمل اسلام کی اصطلاح میں دین کہلاتا ہے۔ اس پر تو دور جدید کے تمام مسلم مفکرین متفق ہیں کہ دین کا ترجمہ مذہب یا ریلیجن نہیں ہے۔ لیکن اس کا مناسب اردو یا انگریزی متبادل کیا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف اہل علم نے مختلف متبادل اصطلاحات تجویز کی ہیں۔ تاہم نظام زندگی، اسلوب حیات، عمومی رویہ یا انگریزی لفظ کلچر یا سسٹم بڑی حد تک اس جامعیت کے مفہوم کو ادا کر دیتے ہیں جو دین کے لفظ میں پوشیدہ ہے۔ قرآن پاک میں جہاں جہاں دین کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اس کے مفاہیم میں نظام جزا و سزا، قانون، تہذیب و تمدن، عبادات اور مذہبی عقائد وغیرہ شامل ہوتے ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ زندگی کے یہ سب پہلو دین میں شامل ہیں۔

قرآن پاک کی نظر میں دین (یعنی زندگی کا عمومی رویہ اور نظام حیات) دو ہی ہیں۔ ایک وہ جو اللہ کی مرضی اور منشا کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے پر مبنی ہو اور دوسرا وہ جو اللہ کی مرضی اور منشا سے انحراف سے عبارت ہو۔ اللہ کی نظر میں زندگی کا پہلا رویہ ہی قابل قبول ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران ۳:۱۹) یعنی اللہ کے نزدیک دین وہی ہے جو اس کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دینے سے عبارت ہو۔ اس طرز عمل کے علاوہ اگر کوئی طرز عمل انسان اختیار کرے گا تو اللہ کی بارگاہ میں قابل قبول نہ ہو گا (آل عمران ۳:۸۵)۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں ادیان کا لفظ صیغہ جمع میں کہیں نہیں آیا۔ شاید اس لیے کہ دین کی کوئی تیسری قسم واقعتاً موجود ہی نہیں ہے۔ اللہ کی مرضی سے انحراف کی بہت سی صورتیں اور محرکات و عوامل ہو سکتے ہیں لیکن انحراف ہونے کی حیثیت

سے وہ سب صورتیں ایک ہی زمرہ میں شمار ہوں گی۔

قرآن پاک سے پتا چلتا ہے کہ دین اسلام (یعنی اللہ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دینے کا رویہ) ابتدائے آفرینش سے خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی رہا ہے۔ تمام انبیا علیہم السلام نے اسی ایک دین کی دعوت دی جس کی بنیادیں توحید، رسالت اور آخرت کے اصول سہ گانہ پر ایمان، انبیا کی لائی ہوئی شریعت پر عمل درآمد اور مکارم اخلاق کا اختیار کرنا تھا۔ مختلف انبیا نے اپنے اپنے مخاطبین کی ذہنی اور ثقافتی سطح کے مطابق ان اصولوں کی تعلیم دی۔ جب انسانیت عہد طفولیت کے مرحلہ سے گزر رہی تھی تو اس وقت کے انبیا نے سادہ اور ابتدائی اصولوں تک اپنی تعلیم و تبلیغ کو محدود رکھا۔ جوں جوں انسانیت ارتقا کے مراحل طے کرتی گئی انبیا کی تعلیم میں بھی وسعت اور گہرائی آتی چلی گئی۔ یہی حال انبیا کی لائی ہوئی شریعتوں کا بھی رہا۔ جن اقوام میں ڈسپلن اور نظم و ضبط کی کمی تھی ان کو سخت احکام دیے گئے۔ جن قوموں میں قانون پسندی کا مطلب ظاہر پرستی اور حرفیت پسندی قرار پایا ان کو ایسے احکام دیے گئے جن کے ذریعے قانون کی اصل روح کو اجاگر کیا جاسکے۔

دین کے اصولوں پر عمل درآمد اور انسانی زندگی میں ان اصولوں کی عملی تشکیل کا واحد راستہ شریعت کہلاتا ہے۔ یہ اصطلاح قرآن پاک میں بھی مختلف صیغوں (شریعت، شرعۃ، شرع) میں استعمال ہوئی ہے اور احادیث مبارکہ میں بھی بار بار آئی ہے۔ اصطلاحی اعتبار سے اس سے مراد زندگی گزارنے کا وہ راستہ ہے جو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ لغوی اعتبار سے شریعت سے مراد وہ کشادہ، سیدھا، واضح اور صاف راستہ ہے جو کسی بستی کے لوگوں کو پانی کے ذخیرہ اور مصدر و ماخذ تک پہنچا دے۔ پرانے زمانہ میں دیہاتوں کے ماحول میں جب گھروں میں پانی کی فراہمی کا انفرادی بندوبست نہیں ہوتا تھا، عموماً بستی سے باہر کسی کنویں، تالاب، نہر یا چشمہ وغیرہ سے پانی لایا جاتا تھا اور انسانوں اور مویشیوں کے بار بار وہاں آنے جانے سے ایک ایسا راستہ بن جاتا تھا جو سیدھا، مختصر، کشادہ، واضح اور صاف ہوتا تھا۔ اسی راستہ کو عربی لغت میں شریعت کہا جاتا تھا۔

قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں اسلامی نظام زندگی کے لیے شریعت کی اصلاح کا استعمال بڑا اہم اور معنی خیز ہے۔ اس اصطلاح سے اسلامی قانون کے مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اسلام کی نظر میں انسان کی یہ موجودہ زندگی محض ایک عارضی زندگی ہے جو ایک مختصر سے وقفہ میں ایک سفر کی حالت میں ہے اور مسلسل حقیقی زندگی کی طرف سفر کر رہی ہے۔ انسان حقیقی زندگی کے سفر پر جس راستہ سے گزر کر کامیاب ہو سکتا ہے وہ راستہ شریعت کے نام سے موسوم کیا گیا۔

قرآن مجید میں ایک جگہ (انبیا ۲۱: ۳۰) یہ بتایا گیا ہے کہ ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا

ہے۔ یعنی پانی زندگی کا ماخذ و مصدر ہے اور جو راستہ زندگی کے ماخذ و مصدر تک لے جائے وہ لغوی اعتبار سے شریعت کہلاتا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک میں ایک جگہ (عنکبوت ۲۹: ۶۴) میں بتایا گیا ہے کہ آخرت کی زندگی ہی دراصل حقیقی اور دائمی زندگی ہے۔ لہٰذا جو راستہ حقیقی اور دائمی زندگی کے ماخذ و مصدر یعنی اخروی کامیابی تک لے جائے وہ بھی شریعت ہی کی اصطلاح سے موسوم کیا گیا۔ پھر ایک شریعت ہی کی اصطلاح نہیں، اسلام کی دوسری بہت سی اصطلاحات میں سفر اور راستہ کا مفہوم موجود ہے، جو مسلسل ایک مسلمان کو یہ یاددہانی کراتا رہتا ہے کہ یہ زندگی ایک چند روزہ سفر سے عبارت ہے جس کی منزل مقصود کہیں اور ہے۔ چنانچہ صراط مستقیم جس کی دعا ہر مسلمان دن رات میں کم از کم سترہ مرتبہ ضرور کرتا ہے، اسی سیدھے راستے کا دوسرا نام ہے، جس کو شریعت کہا گیا ہے۔ پھر سبیل، طریقت، سلوک، مقامات، منازل، توبہ، رجوع، انابت وغیرہ بہت سی اصطلاحات میں یہی سفر اور راہ راست پر چلنے کا مفہوم ملتا ہے۔ علاوہ ازیں زاد راہ، دلیل، امام، نور وغیرہ بھی ضروریات سفر ہی میں سے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر اس واضح راستہ یعنی شریعت کی امتیازی خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔ ایک مشہور حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ میں جو راستہ لے کر آیا ہوں وہ یکسوئی کے ساتھ منزل مقصود تک لے جانے والا (حنفیۃ)، نرمی اور آسانی پیدا کرنے والا (سمحۃ)، سہولت بخش (سہلۃ) روشن (بیضا) اور اتنا واضح کہ اس کی رات بھی اس کے دن کی طرح چمکدار ہے (لیلھا، کنھارھا)۔ یہ سب وہی خصوصیات ہیں جو شریعہ کے لغوی مفہوم میں بھی پائی جاتی ہیں۔

کامیابی کے اس راستہ پر سفر کی کئی سطحیں ہیں۔ ایک سطح عقائد، ذہنی تصورات اور عقلی نظریات کی سطح ہے۔ یہ شریعت کا وہ حصہ ہے جس سے علم کلام یا علم عقائد میں بحث ہوتی ہے۔ اس شعبہ علم کو آج کل بعض عرب مولفین علم توحید کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ شریعت کا یہ حصہ انسانی زندگی کے ان بنیادی سوالات سے بحث کرتا ہے جن پر انسان کی پوری زندگی کا دارومدار ہے۔ اس دنیا میں انسان کی حیثیت اور مقام و مرتبہ کیا ہے، وہ کہاں سے آیا ہے، کیوں آیا ہے، کیسے آیا ہے، اس کے آنے کا مقصد کیا ہے، اس کے آنے کے مقصد کا تعین کون اور کیسے کرے گا؟ انسان کی اس زندگی کی حقیقت کیا ہے، اس زندگی کے بعد اسے کہاں جانا ہے اور کس طرح جانا ہے، یہ اور اس طرح کے بہت سے دوسرے سوالات انسان کی کامیاب زندگی کے لیے بڑی بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ جب تک ان سوالات کا کوئی نہ کوئی جواب انسان کے پاس موجود نہ ہو، وہ اپنی زندگی کا کوئی نظام مرتب نہیں کر سکتا۔ دنیا کے ہر قانون، فلسفہ، نظریہ اور تہذیب و ثقافت کی پشت پر ان سوالات کا کوئی نہ کوئی جواب ضرور موجود ہوتا ہے جس سے اس کا نظریہ کائنات یعنی weltan schauung وجود میں

آتا ہے۔

ان بنیادی سوالات کا جواب دینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اسلام نے ان معاملات کو انسانی عقل و فکر کے دائرہ سے باہر کر دیا ہے اور ان امور میں عقل کا دائرہ محدود کر دیا ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام نے پیچیدہ بنیادی مسائل اور لاینحل عقدوں کو حل کر کے انسانی عقل کی سرگرمیوں کو ایک مثبت اور بامعنی سمت عطا کر دی ہے۔ اب انسانی عقل کے لیے اس بنیادی روشنی سے کام لے کر فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کے بنیادی مسائل کا حل کر دینا بہت آسان ہو گیا ہے۔ اب انسانی عقل ان بھول بھلیوں میں بار بار گم نہیں ہو گی جو ان سوالات کا جواب فراہم نہ ہونے کی وجہ سے بار بار راہ سے بھٹکی ہے۔ اب ہر نئے آنے والے فلسفی اور مفکر کو از سر نو ان سوالات پر غور کر کے نت نئے اور مضحکہ خیز جوابات دینے اور پہلے سے موجود فکری الجھنوں کو اور الجھانے کی ضرورت نہیں۔ اب قرآن پاک نے ان تمام بنیادی گتھیوں کو حل کر دیا ہے جن کے حل نہ ہونے کی وجہ سے ہزارہا سال سے انسانی عقل دربدر کی ٹھوکریں کھاتی رہی ہے۔ یہ بنیادی سوالات جن کے جوابات کو اسلامی فکر میں اصول موضوعہ کی حیثیت حاصل ہے، 'عقائد' کے نام سے موسوم ہیں۔ عقیدہ جس کے لفظی معنی گرہ کے ہیں انسانی ذہن و فکر کی وہ لگام ہے جو اس کو راہ راست پر قائم رکھتی ہے۔

عقائد کے بعد دوسری سطح انسان کے قلبی احساسات اور جذبات و عواطف کی سطح ہے۔ شریعت کی تعلیم کا وہ حصہ جو ان امور کو منضبط کرتا ہے 'تزکیہ یا احسان' کہلاتا ہے۔ اسلام نے انسانی زندگی کے اس پہلو کو بڑی اہمیت دی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کی رو سے جب تک انسان کے قلبی احساسات درست اور مثبت رہتے ہیں' انسان کی پوری زندگی درست اور مثبت رہتی ہے۔ مگر جوں ہی قلبی احساسات بگڑتے اور منفی رخ اختیار کرتے ہیں' انسان کی پوری زندگی بگڑ کر منفی راستہ پر چل پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انسان کے جذباتی استحکام اور قلب کی راست روی پر بڑا زور دیا ہے اور اپنی تعلیم کا ایک اہم حصہ اس کے لیے وقف کیا ہے۔ لیکن جذباتی استحکام اور قلبی راست روی آسان کام نہیں ہے۔ زندگی میں ہزاروں منفی قوتیں اور لاکھوں ترغیبات ایسی موجود ہیں جن سے دامن بچا کر کامیابی سے نکل جانا بڑی پختہ تربیت اور مستحکم ایمان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ پختہ تربیت اور مستحکم ایمان اللہ کی بارگاہ میں دائمی حضوری کے احساس و ایقان کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ حضوری کا یہی احساس و ایقان ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان سے تعبیر فرمایا ہے۔ حدیث جبریل میں جب آپؐ سے پوچھا گیا کہ احسان کیا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اس لیے کہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے تو وہ تو تمھیں دیکھ رہا ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے جس روحانی تربیت اور مکارم اخلاق کی مشق کی

ضرورت ہوتی ہے اس کو قرآن مجید میں تزکیہ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ روحانی پاکیزگی اور مکارم اخلاق کی تربیت جو پیغمبر کی چہار گانہ ذمہ داریوں میں سے ایک ہے، ایک طویل کوشش، مسلسل مشق اور جاں گسل روحانی سفر کی متقاضی ہے۔ اس روحانی سفر کو سلوک اور سیر کی اور اس مشق کو مجاہدہ کی اصطلاحات سے یاد کیا جاتا ہے۔ جن تعلیمات و ہدایات اور تدابیر کی اس سفر میں ضرورت پڑتی ہے ان کو طریقہ یا طریقت کا نام دیا گیا۔ یہی علم طریقت ہے جو بعد میں تصوف کہلایا۔ طریقت یا روحانی سفر کا یہ راستہ چوں کہ بڑا دشوار ہوتا چلا گیا اور مادی ترغیبات کے آئے دن نت نئے حملوں نے نئی نئی تدابیر کی ضرورت کا احساس دلایا اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ یہ سفر کسی باکمال راہبر کی نگرانی میں طے کیا جائے جو تقویٰ، اتباع سنت، التزام شریعت اور روحانی پاکیزگی کی صفات سے متصف ہو۔ اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے باکمال راہبروں کی تلاش خود اپنی جگہ ایک اہم مسئلہ قرار پایا۔ اور ایک بار راہبر مل جائے تو اس کے قافلہ (سلسلہ) سے وابستہ رہنا گویا سفر کی سہولت اور منزل کی ضمانت ٹھہرا، اس طرح سلسلہ ہائے تصوف وجود میں آگئے۔

تزکیہ و احسان کے بعد تیسری سطح انسان کی ظاہری اور عملی زندگی کی ہے۔ شریعت کا وہ حصہ جو انسان کے ظاہری اعمال و افعال کو منضبط کرتا ہے، فقہ کہلاتا ہے۔ انسان کے جسمانی افعال و اعمال اور اعضا و جوارح کی سرگرمیاں لامتناہی ہیں۔ وہ رات کو بستر پر آرام سے لے کر بین الاقوامی سطح تک کی لاکھوں قسم کی سرگرمیوں میں مصروف رہتا ہے۔ ان سب اعمال کو کسی قاعدہ اور ضابطہ کے تحت منضبط کرنا شریعت کی تعلیم کا سب سے بڑا اور سب سے اہم حصہ ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا کہ شریعت کی تعلیم کے مذکورہ بالا دونوں پہلو، ایک اعتبار سے اسی تیسرے پہلو کی تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں اور انسان کو اس کے لیے تیار کرتے ہیں۔ چونکہ شریعت کی تعلیم کا یہ حصہ اپنے موضوع کی کثرت اور تنوع کے اعتبار سے سب سے بڑا ہے اس لیے بعض اوقات شریعت کی اصطلاح کا اطلاق اسی پر کر دیا جاتا ہے۔ اور ارباب تسمیہ الجزء باسم الکل شرعیت کے اس حصہ کو ہی شریعت کہہ دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے فقہ اور شریعت کی اصطلاحات کبھی کبھی مترادف کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہیں۔

فقہ کے لفظی معنی کسی چیز کی گہری فہم اور سمجھ بوجھ کے ہیں۔ بظاہر فقہ کے لفظی معنی اور انسان کے ظاہری اعمال کو منضبط کرنے والے مجموعہ ہدایات کے درمیان کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن تھوڑا سا غور کرنے سے یہ مناسبت واضح ہو جاتی ہے۔

انسان اپنی زندگی میں جتنے اعمال بھی کرتا ہے وہ لامتناہی ہیں۔ ایک دوکاندار کو دوکان داری اور تجارت کے دوران بے شمار قسم کے اعمال اور سرگرمیاں اختیار کرنا پڑتی ہیں۔ ایک شخص کھانا کھانے ہی کے دوران بیسیوں قسم کے عمل کرتا ہے۔ ملازمت کرنے والے کو ملازمت کے سلسلہ میں ہزاروں

اعمال و افعال سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان اعمال کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ ان کا شمار ہو سکتا ہے۔ اربوں اور کھربوں سے بھی شاید ان کی تعداد متجاوز ہی ہوگی۔ ان کے مقابلہ میں شریعت کی وہ ہدایات (نصوص) جو ان کھربوں اعمال کو منضبط کرتی ہیں، وہ بہت ہی محدود ہیں۔ قرآن پاک کی چھ ہزار چند سو آیات میں سے بمشکل چند سو وہ ہیں جو براہ راست عملی ہدایات دیتی ہیں اور جن کو آیات احکام کہا جاتا ہے۔ اسی طرح چالیس پچاس ہزار احادیث کے ذخیرہ میں وہ احادیث جو براہ راست عملی ہدایات پر مشتمل ہیں اور جن کو احادیث احکام کہا جاتا ہے، اڑھائی تین ہزار سے متجاوز نہیں ہیں۔ گویا یہ تین ہزار چند سو نصوص اربوں انسانوں کے کھربوں اعمال کو منظم و منضبط کرتی ہیں۔

ان چند ہزار نصوص کی روشنی میں انسان اعمال کو منظم و مرتب اور منضبط کرنے کا یہ اہم ترین عمل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان نصوص پر گہرا غور و فکر نہ کیا جائے اور اچھی بصیرت اور عمیق فہم سے کام نہ لیا جائے۔ اس لیے عمیق فہم اور گہری بصیرت اس پورے عمل کا لازمی حصہ ہے جس کے بغیر شریعت کی تعلیم کے اس حصے پر عمل در آمد نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف قرآن پاک میں بلکہ احادیث نبویؐ اور پورے اسلامی ادبیات کے ذخیرے میں فقہ کا لفظ اسی بصیرت افروز، بصیرت آمیز اور مبنی بر بصیرت تعلیم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جس کی گہرائی اور گیرائی کی مثال انسانی فکر و علوم کی تاریخ میں ناپید ہے۔ فقہ کے ارتقا اور تشکیل میں مسلمانوں کے بہترین دماغوں نے حصہ لیا ہے اور اس مجموعہ علوم کو بجا طور پر اسلامی علوم و ثقافت اور تہذیب و افکار کا گل سرسبد قرار دیا جانا چاہیے۔

فقہائے کرام نے فقہ کی بہت سی تعریفیں کی ہیں۔ جن میں جو بات قدر مشترک ہے وہ یہ ہے کہ یہ شریعت کے احکام کا وہ حصہ ہے جو انسان کے اعمال (بمقابلہ افکار و احساسات) سے بحث کرتا ہے۔ عام طور پر فقہائے کرام کے ہاں جو تعریف مقبول و معروف ہے وہ ہے: العلم بالاحکام الشریعة العملیة عن ادلتها التفصیلیة یعنی فقہ وہ علم ہے جس کے ذریعہ شریعت کے عملی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے حاصل کیا جائے۔ معاصر عراقی فقیہ استاذ عبدالکریم زیدان کی رائے میں فقہ کی یہ تعریف سب سے زیادہ مقبول اور پسندیدہ ہے۔

انسان کی عملی زندگی اور اس کے ظاہری اقوال و افعال کو منظم و منضبط کرنے والے علم کی حیثیت سے فقہ کا دائرۂ کار قریب قریب پوری انسانی زندگی کو محیط ہے۔ انسان کی پیدائش سے لے کر مرنے تک اس سے جو بھی اقوال و افعال سرزد ہوتے ہیں، فقہ ان سے بحث کرتی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ فقہ کے احکام کا اطلاق انسان کی ذات پر اس کی پیدائش سے پہلے سے شروع ہو جاتا ہے اور مرنے کے بعد تک جاری رہتا ہے۔ اس پوری مدت میں انسان کا کوئی قول یا فعل ایسا نہیں جس کے بارے میں فقہ کا کوئی مثبت یا منفی موقف نہ ہو اور جس کے بارے میں فقہ کا کوئی حکم موجود نہ ہو۔

ایک شخص وفات پا جاتا ہے اور اس کی بیوہ کے ہاں چند ماہ بعد بچے کی ولادت ہونے والی ہے۔ اب اس مرنے والے کی جائیداد اس وقت تک تقسیم نہیں ہو سکے گی جب تک اس میں اس نئے آنے والے بچے کا حصہ نہ رکھ دیا جائے۔ بعض فقہا کی رائے تو یہ ہے کہ ابھی سرے سے وراثت ہی تقسیم نہیں کی جائے گی اور بچے کی پیدائش کا انتظار کیا جائے گا۔ اگر وہ لڑکا ہو تو لڑکے کا حصہ اس کو دیا جائے گا اور لڑکی ہو تو لڑکی کا۔ گویا ابھی بچے کی پیدائش نہیں ہوئی لیکن اس کی متوقع پیدائش کے عمل پر احکام شریعت کا اطلاق ابھی سے شروع ہو گیا' بالفاظ دیگر بچہ نے اپنی پیدائش سے قبل ہی شریعت کا حکم امتناعی حاصل کر لیا اور وراثت کی تقسیم روک دی۔

اسی طرح ایک شخص وفات پانے سے قبل اپنی کچھ جائیداد وقف کر دیتا ہے یا اپنی جائیداد کے ایک حصے کے بارے میں وصیت کر جاتا ہے کہ وہ فلاں مد میں خرچ کر دیا جائے۔ اب جب تک وہ جائیداد یا وہ حصہ دنیا میں موجود ہے وہ مرنے والے کے وقف کی شرائط یا وصیت کی تفصیلات کے مطابق ہی استعمال کیا جائے گا' چاہے اس پر سیکڑوں سال گزر جائیں۔ اس لیے کہ شریعت کا اصول ہے: شرط الواقف کنص الشارع وقف کرنے والے کی طے کردہ شرائط اسی طرح واجب التعمیل ہیں جس طرح شریعت کی نصوص۔ مثلاً وقف کرنے والے نے طے کیا یا وصیت کرنے والے نے وصیت کی کہ اس کی موقوفہ یا وصیت شدہ جائیداد کی آمدنی فلاح علاقہ کے لوگوں کو دی جایا کرے یا فلاں فلاں کو دے دی جائے۔ یا اس کو مثلاً کمپیوٹر سائنس کے طلبہ کی تعلیم اور ان کو وظائف کی فراہمی پر خرچ کر دیا جائے تو اس رقم کو اسی علاقہ کے لوگوں کو دیا جائے گا اور اس سے کمپیوٹر سائنس کے طلبہ ہی کو وظائف دیے جائیں گے۔ اسلامیات حتیٰ کہ قرآن و حدیث کے طلبہ تک کو اس رقم سے وظیفہ دینا جائز نہ ہو گا۔

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا سے انسان کے چلے جانے کے بعد بھی اس کے اقوال و اعمال و افعال پر فقہی احکام کا اطلاق ہوتا رہتا ہے اور جب تک انسان کے اقوال و اعمال کے اثرات و ثمرات باقی ہیں وہ فقہ کے احکام سے منظم و منضبط ہوتے رہیں گے (جاری)۔

امریکہ و کینیڈا میں ماہ نامہ ترجمان القرآن و روز نامہ جسارت اور دیگر تحریکی رسائل

حاصل کرنے کیلئے درج ذیل پتہ پر رابطہ قائم کیجیے۔

Islamic Education & Media

730 E 10St GF Brooklyn NY 11230

PH: (718) 421 - 5428

عمر عبدالعزیز، نمائندہ ترجمان القرآن و جسارت برائے امریکہ و کینیڈا